جس وقت میں ریگل کے چوک میں بس پر سے اترا تو مجھے معلوم تھا کہ سیمی مجھے آج وائی ڈبلیو سی اے میں نہیں ملے گی۔ اس کے باوجود میں آہستہ آہستہ اس کے ہوسٹل کی طرف چلنے لگا۔ دھوپ میں اب حدت نہ رہی تھی اور سینٹ انتھونی سکول سے ملحق گرجا آج سورج کی کرنوں میں دھلا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک فادر سیاہ چغے میں ملبوس گرجے کے مرکزی پھاٹک کو کھول کر اندر چلا گیا گرجے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور میں سوچتا رہ گیا کہ اندر جانے والا کون تھا۔۔۔؟ دیسی عیسائی۔۔۔ امریکی فادر۔۔۔ یا ڈچ برادر۔۔۔؟ لوگ اپنے دیس کو چھوڑ کر کیوں پردیس میں جا بیٹھتے ہیں۔۔۔؟ پردیس میں کیا چیز انہیں باندھے رکھتی ہے۔۔۔؟ عقیدہ؟۔۔۔ محبت؟۔۔۔ عمارت۔۔۔ یا انا؟

اس مختصر سڑک کے اختتام پر پٹرول پمپ کے پاس میں بائیں مڑ گیا۔ لیکن پٹرول پمپ سے شارٹ کٹ کرنے سے پہلے میں نے پلازا سینما کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس وقت میں چاہتا تو سیدھا جناح باغ جناح جا سکتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا شاید سیمی ابھی وائی ڈبلیو سی اے میں موجود ہو پلازہ سینما میں ابھی ساڑھے تین بجے کا شو ٹوٹا تھا۔ فری میسن کی بلڈنگ سے لے کر پٹرل پمپ والے چوراہے تک کاریں۔ رکشا سائیکلیں پیدل سب بڑی افراتفری کے ساتھ جلدی گزر جانے کی آرزو میں ٹریفک کے لیے اڑچنیں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے ساری بھیڑ کی طرف نگاہ دوڑائی اور جی میں سوچا۔۔۔ اس ساری خلقت کو علم نہیں کہ وائی ڈبلیو سی اے میں ایک دبلی پتلی لڑکی۔۔۔ ایک ماڈرن لڑکی اپنے آپ پر تیل چھڑک کر مرنے کے لیے تیار کھڑی ہے ہم شہر والے ایک دوسرے سے کتنے بے خبر تھے۔ پٹرول پمپ کے سامنے بڑے سائن بورڈ پر ایک پنجابی فلم کا اشتہار لگا تھا۔ ہیروین کی آنکھیں حیران کن حد تک سیمی جیسی تھیں۔ آفتاب کا نام سنتے ہی جیسی کیفیت سیمی کی ہوتی ویسی ہی سائن بورڈ والی لڑکی کی

آنکھوں سے عیاں تھی میں نے ہاتھ ہلا کر فلم والی کو خدا حافظ کہا اور وائی ڈبلیو سی اے چلا گیا۔

یہ ہوسٹل بھی چمگادڑوں کی آماجگاہ تھی۔

اس ہوسٹل سے لے کر فاطمہ جناح تک آزاد عورتیں اور لڑکیوں کا ٹریننگ کیمپ تھا گھروں سے بیزار، روزگار کی تلاش میں پریشان، ڈاکٹر بننے اور مستقبل سنوارنے کی آرزو میں بے قرار، عاشقوں سے رنجیدہ، شوہروں کی تلاش پر مصر، گھر رہتی تھیں رات کے پچھلے پہر جب کبھی میں یہاں سے گزرا ہوں مجھے فاطمہ جناح کالج سے لے کر وائی ڈبلیو سی اے کے ہوسٹل تک اور حضرت یقوب زنجانی کے مزار تک آہوں کا ایک مرغولہ اس رقبے پر معلق نظر آیا خاموشی ہوتی تو ہلکی ہلکی سرگوشیاں اور آہیں بھی سنائی دیتی ہیں جیسے ایک ساتھ کئی چپو ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ہولے سے اتریں۔

ڈاکٹری سیکھنے والیاں چوک کے اس پار رہتی ہیں ٹائپ کی کلاسوں میں حاضر باش رہنے والیوں سے کئی بار میرا ٹاکرا ہوا وائی ڈبلیو سی اے میں پلازہ سینما کے شو کے ساتھ ساتھ یہاں بھی کلاس ٹوٹا کرتی تھی۔۔۔۔سب خوش لگتی تھیں۔۔۔۔ سب کی سب خوش فہمیوں میں مبتلا تھیں۔۔۔۔شام کے باوجود اکثریت کے چہرے پر سیاہ چشمے ہوتے جو سائیکلوں پر تھیں وہ اپنے آپ کو زیادہ ماڈرن سمجھ رہی تھیں۔جو پیدل تھیں وہ اپنے آپ کو زیادہ باحیا سمجھنے پر مجبور تھیں۔۔۔۔لیکن سب کے چہرے پر کسی نہ کسی طرح کی Disillussionment ہلکی سی گرد۔۔۔ازالہ سحر کی عدم میلان طبعیت۔۔۔کی۔۔۔ہلکی سی میک اپ کی تہہ۔۔۔۔

یہ تمام عورتیں لڑکیاں کسی نہ کسی طرح مردوں کے نارمل نیوکلس سے کٹی ہوئی تھیں ہوکستا ہے ان میں سے بیشتر عورتوں کو مردوں کا قرب زیادہ ملتا ہو، لیکن معاشرے کے رسمی طریقے کے مطابق وہ Carrier گرلز تھیں۔ایسی مینڈکیاں جن کو ہلکا ہلکا زکام ہو چکا تھا وہ اعلانیہ سگریٹ پیتی تھیں کماؤ سپوت کی طرح گھروں میں پیسے بھیجتی

تھیں ان کے بھائی چچا ماموں نہ جانے کون تھے۔۔۔۔کہاں تھیاور اگر تھے تو کس حد تک ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکتے تھے؟۔۔۔۔یہ سب تو چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح پھڑک رہی تھیں۔۔۔۔۔تڑپ رہی تھیں اور اپنے اصلی رسمی نیوکلس کی تلاش میں تھیں۔

سیمی بھی ان ہی چہروں میں سے ایک تھی۔۔۔۔۔اس کے طہرے پر بھی ہلکی سی گرد رہتی تھی میک اپ کی۔۔۔۔ازالی سحر کی۔۔۔۔عدم میلان طبعیت کی۔۔۔۔فریب آرزو کی۔۔۔۔۔

میں نے پورچ میں کھڑے ہو کر دوسرا سگریٹ پیا۔اندر پیام بھجوایا اور گو مجھے معلوم تھا کہ سیمی اندر نہیں ہے پھر بھی میں منتظر رہا۔اور جب تصدیق ہوگئی کہ وہ صبح کی کہیں گئی ہوئی ہے تو میں ٹائپ سیکھنے والی لڑکیوں میں راستی بناتا جناح باغ کی طرف چل دیا۔

مین پھاٹک میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک نگاہ ہمایوں رسالے کے مسکن پر ڈالی۔۔۔۔۔بڑے بڑے درختوں سے گھرا ہوا گھر۔۔۔۔یہاں سے کبھی ہمایوں رسالہ نکلتا تھا۔

ہمایوں رسالہ۔۔۔۔اودھ پنچ؟۔۔۔۔ادبی دنیا۔۔۔۔یہ سب کہاں تھے۔ان کے خالق کہاں تھے؟ ہر عہد میں کچھ ایسے لوگ ضرور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔جو اپنے عہد کے لوگوں کو بڑے فلک پیا لگتے ہیں مگر رفتہ رفتہ وقت انہیں یوں ڈھانپ لیتا ہے جیسے اونچی پرانی قبروں میں اونچی اونچی گھاس آگے آئے اور کتنے گر جائیں قبریں باقی رہیں لیکن دیئے جلانے والے کسی اور قبرستان میں جا کر رت جگا کریں۔ کچھ بڑے لوگ تو اپنا نام وقت کی لہروں پر ثبت کر جاتے ہیں کچھ سیمی کی طرح کوئی نشان چھوڑ کر نہیں جس سکتے۔

سسی کا عشق سیمی سے کیسے بہتر تھا؟

اگر سیمی مر گئی میں نے پہلی بار سوچا تو کیا میرے علاوہ کوئی جان سکے گا کہ اسے کیا بیماری تھی۔۔۔۔۔؟ میرے پاس تو نہ کوئی ہمایوں تھا نہ اودھ پنچ نہ ادبی دنیا۔ پھر میں تو اس کے لیے اپنے عہد والوں تک بھی کوئی داستان چھوڑ کر نہ جا سکوں گا اپنے عہد میں بھی اس کے عشق کی داستان فلک پیما نہ ہو سکے گی۔۔۔۔ یہ بھید کیسا الیمہ تھا؟

باغ بہت رونق تھی۔ منٹگمری ہال پر شام کی آخری روشنی پڑ رہی تھی۔ بار بار کہیں سے پاپڑ بیچنے والے کی آواز باغ کی خاموشی پر گرتی اور برف کی طرح چکنا چور کر دیتی تھی۔ لذت کا باغوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جب گھروں کی گھٹن بہت بڑھ جاتی ہے جب مرد کسی عورت سے بند کمرے میں مل نہیں سکتا یا ملنا چاہتا تو پھر وہ باغوں کا رخ کرتا ہے باغوں میں انتظار، وصل، بجوگ اور نیوگ کے بونے جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھے ملتے ہیں درخت پودے گھاس پھول سب ان عنصریتوں کی کھیلوں میں بار بر کے شریک رہتے ہیں اسی لیے باغوں کی خوشبو میں ایک سحر ہوتا ہے یہاں کئی کہانیاں ایک ساتھ بولتی ہیں جیسے ستاروں کے اوپر والے تار مضراب سے چھیڑو تو تر بیں آپی آپ بول اٹھتی ہیں۔

میں نے سارے میں تلاش کیا لیکن سیمی کہیں نہیں تھی۔۔۔۔ میں نے تیسرا سگریٹ سلگایا اور کافور کے درخت تلے بیٹھ گیا۔ لوگ شاید اپنے گم شدہ وجود، اپنی سائیکی آزادی اور جبلی آرزوں کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ کیونکہ آک خلاف معمول سڑکوں پر بہت ہجوم تھا لوگ کس خوشی سے باغوں کا رخ کرتے ہیں اور کتنی جلدی کیسی مایوسی کے ساتھ لوٹ جاتے ہیں شاید مصنوعی باغوں میں باڑھوں سے، فواروں میں، بنچوں پر، کیاریوں سے کیفے کی میز کرسیوں کے اوپر نیچے باغ میں پھیلی پکی سڑکوں سے مہذب چہری زندگی کا بلاوا اتارتا ہے ہمارے اندر کا ریڈیو اس آواز کو ہوا سے پکڑتا رہتا ہے ایسے میں سیر کرنے والے دوستوں میں گھستے ہیں۔ فطرت سے رشتہ بحال کرنے والے بادل، درخت پھول ہریادل، پرندو سب اسے جنگلوں

کی طرف کھینچتے ہیں اور مصنوعی فوارے، سڑکیں، کیفے، موزیک، کی پتھریلی بنچیں، اسے تہذین کلچر اور شہر کی طرف موڑتی ہیں اسی کشمکش میں کئی بار اندر سے انسان بدکے ہوئے گھوڑے کی طرف الف ہو جاتا ہے لیکن چھوٹ نہیں سکتا۔

باغوں کی سائیکی بہت اداس ہوتی ہے رکے ہوئے آنسو بند خیالات، جمہ ہوئی آہیں۔۔۔۔قدرتی اداسی پولن کی طرح جھڑتی ہے اسی لیے کسی عہد کسی قوم کسی چہر کی سائیکی کو سمجھنے کے لیے اس کے باغوں میں بیٹھنا بہر ضرور ہے۔

جس وقت رات گئے سیمی آئی تو مجھے پہچانے بغیر میرے پاس سے گزر گئی۔۔۔۔ میں نے سگریٹ کی خالی ڈبیا درخت تلے پھینکی اور اس کے تعاقب میں چلنے لگا۔ حالانکہ میں اس سے صرف دو قدم پیچھے تھا۔لیکن میں نے اسے آواز نہ دی۔ بابا ترت مراد کے مزار کے پاس جا کر وہ اچانک رک گئی اس نے جوتیاں اتاریں۔سر پر ایک پھول دار رومال باندھا اور مزار کی دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔بڑی دیر تک وہ وہاں ایک ٹرسٹ کی طرح کھڑی قوالی سنتی رہی۔پھر سر سے پھول دار ریشمی والا چشمہ اتار کر اور لکڑی کی ہیل والی جوتیاں پہن لیں میں نے اسے بلانا چاہا لیکن کوئی شے مجھے بھی مانع رکھ رہی تھی۔

وہ بجری کو اپنی کڈھب جوتیوں سے کوٹتی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔پھر اس نے رک کر دیہاتی لوگوں کی طرح ہاتھ سے ناک صاف کیا تو میں نے آگے بڑھ کر اسے رومال پیش کر دیا۔

''تم کب آئے قیوم؟۔''

''میں تمہارے ساتھ ساتھ تھا۔''

''کب سے۔''

''کافی دیر سے''

''پھر بھی؟۔۔۔۔تم مجھے نظر کیوں نہیں آئے''

''کیونکہ نظر انے اور نظر نہ آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی۔''

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔لب خشک تھے اور میک اپ کی ہلکی تہہ کے باوجود وہ تمام تر بے رونق تھی۔

''تم کو معلوم ہے مجھے لگتا ہے آج کل میں زلزلہ آئے گا لاہور میں۔''

''کیوں؟''

''بس لگتا ہے بڑی دیر ہو گئی زلزلہ آئے۔''

''زلزلے کی یہ کوئی خاص وجہ نہیں۔''

وہ کافور کے درخت کے پاس پہنچ کر عادتاً گراؤنڈ میں اتر گئی۔

''کیا ہی اچھا ہو اگر اس بار زلزلے میں گورنمنٹ کالج کا ٹاور گر جائے۔''

''کیوں کیوں۔۔۔۔کیوں۔''

''ہائے کچھ تو گر جائے اس سال کرسمس سے پہلے پہلے۔''

''کرسمس کی کیا شرط ہے سیمی۔''

''پچھلے کرسمس کو میں آخری بار آفتاب سے ملی تھی۔۔۔۔قائد اعظم کی سالگرہ والے دن اس سال بھی کچھ ہونا چاہیئے بخدا۔۔۔۔۔اور کچھ نہیں تو گرنمنٹ کالج کا ٹاور ہی گر جائے۔''

''یا بخاری آڈیٹوریم۔۔۔۔میں آگ لگ جائے۔''

''ہاں کچھ تو ہو۔۔۔۔کچھ تو ہو پرانی یادوں کی یاد تازہ کرنے کو۔''

بڑی دیر تک ہم سو مرتبہ دوہرائی ہوئی باتیں از سر نو یاد کرتے رہے آفتاب کا پوسٹ مارٹم ہوا۔لیکن آج اس پر حسد غالب تھا۔اس کا لب ولہجہ زہریلا اور باتیں کڑوی تھیں۔حسد کی گیس پیلے رنگ کی ایسی مسموم گیس ہے جس میں کاربن مونو آکسائیڈ کی تمام خوبیاں موجود ہیں جہاں یہ موجود ہو انسانی پھیپھڑے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔پچھلی ملاقات سے اب تک اس گیس کے اثر تلے وہ بہت بدل گئی

تھی۔ ماتھے پر سوچوں کی وجہ سے ایک نس ابھری ہوئی تھی۔ لہجے میں قطعیت اور لب ٹیڑھے تھے ہاتھوں میں ہلکا ہلکا پسینہ تھا جیسے وہ نوکری کا انٹرویو دینے آئی بیٹھی ہو۔

''یہ مجھے ہوا کیا ہے۔۔۔۔ میں تو کبھی حسد سے آشنا نہ تھی۔۔۔۔ بتاؤ قیوم کیا ہوا ہے؟ اب مجھے آفتاب کا خیال کیوں نہیں آتا۔۔۔۔۔ میں سارا دن زیبا کے متعلق کیوں سوچتی رہتی ہوں۔۔۔ ایک بات بتاؤں''

''کہو۔''

''زیبا حاملہ ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا۔''

''بس مجھے پتہ چل جاتا ہے۔۔۔۔ پہلے ہی۔۔۔۔ مجھے ہوتا ہے ناں پتہ۔۔۔ ۔وہ آج کل سونف کھاتی ہے سارا دن۔۔۔ ہتھیلی پر لیے پھرتی ہے سونف۔''

''چپ کرو۔''

''مجھے نظر آتی ہے زیبا۔۔۔۔ میں اسے دیکھ سکتی ہوں پانچ مہینے کی Pregrancy کے ساتھ۔''

''لیکن تم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''دیکھا ہے دیکھا۔۔۔۔۔ ہے میں تو اسے فوراً پہچان لوں لاکھوں میں۔''

وہ چپ چاپ ہاتھ مروڑنے لگی۔

سامنے جھاڑی میں سے ایک نوگزا آدمی نکلا۔ اس نے بدھ مت کے بھکشوں جیسا لباس پہن رکھا تھا ہاتھ میں اونچا بانس تھا۔ اس بانس پر ایک سبز رنگ کی مشعل روشن تھی۔ وہ دائرے میں چلتا رہا اور پھر مشعل کو نگل کر جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔۔۔ تھوڑی دیر مشعل سمیت جھاڑی چکر لگاتی رہیا ور پھر جھاڑی مشعل نوگزا سب کچھ غائب ہو گیا۔

''یہ سب کیا ہے؟''

''جو سامنے ہو رہا ہے۔''

''نہیں جو میرے دل میں پھوٹ رہا ہے لاوے کی طرح۔''

''حسد میں یہ خوبی ہے سیمی کہ انسان اس میں کھو کر محبوب کے تصور کو کھو بیٹھتا ہے۔ پھر رقیب کے خیالات غالب رہتے ہیں یہ خیالات اس قدر غصیلے زہر آلود اور ہم انگیز ہوتے ہیں کہ محبت کی نازک سوچیں اس گیس بھری فضا میں سانس نہیں لے سکتیں۔ ایسے میں انسان محبت کرتا ہے لیکن بازگشت سے۔۔۔۔ اصل آواز سے نہیں۔۔۔۔ اصلی محبوب تو کہیں اندر ہی اندر گم ہو جاتا ہے حسد کا محبت سے کیا تعلق؟''

وہ احسان مندی سے بولی۔۔۔۔ ''تم بڑے ذہین ہو قیوم۔۔۔۔ سوشیالوجی کی کلاس میں بھی سب تمہاری تعریف کرتے تھے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ لیکن پتہ نہیں تمہاری ان باتوں سے میری تسلی کیوں نہیں ہوتی۔''

اس کے ماتھے پر چڑھی ہوئی نس پر میں نے انگلی پھیری۔

''یہ بتاؤ اب میں کروں تو کیا کروں''

''اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔ تمہیں کیا پتہ قیوم۔۔۔۔ تم میری کتنی بڑی کمزوری بن گئی ہو اگر میں تمہیں نہ ملوں۔۔۔۔ اگر میں کسی سے آفتاب کی باتیں نہ کر سکوں تو اس کی یادوں کے پریشر تلے میں پھٹ جاؤں میں۔۔۔۔ سارے شہر میں اس کی باتیں کس سے کروں قیوم۔۔۔۔ بتاؤ ناں؟''

میں نے کمینگی کے ساتھ کہا۔۔۔۔ ''تم مجھے صرف اس لیے ملتی ہو۔۔۔۔ سیمی کہ تم مجھ سے اس کی باتیں کر سکو۔''

چور سپاہی کے کھیل میں وہ اچانک پکڑی گئی۔

''اور بھی وجہ ہے۔۔۔۔ وجہ ہے ایک اور۔۔۔۔ پر پر۔۔۔۔''

''اور کیا وجہ ہے سیمی۔۔۔۔'' میں نے امید سے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ اس

وقت وہ اعتراف کر لے گی کہ رفتہ رفتہ وہ میری محبت میں مبتلا ہوگئی ہے اور اب وہ آفتاب کا نم بھی لینا نہیں چاہتی لیکن اس کی بات سن کر میرے اندر پہیہ جام سٹرائیک ہونے لگی۔۔۔۔

''اگر تم نہ ہوتے قیوم۔۔۔۔اگر تمہاری ہمدردی محبت نہ ہوتی تو میں کبھی کی خود کشی کر لیتی۔تمہاری محبت نے مجھے یہ قدم اٹھانے نہیں دیا جب مجھے پقرا یقین ہو جاتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں۔۔۔تو یہ تمہاری ہمدردی ہے تمہاری محبت جو مجھ میں خود اعتمادی بحال کرتی ہے۔تم سمجھ نہیں سکتے قیوم میری انا کس حد تک مجروح ہو چکی ہے مجھے اپنی شکل، عقل، عادات، گھرانے اپنے مکمل وجود سے نفرت ہے۔ مجھ میں اگر کچھ بھی اچھا ہوتا تو کیا آفتاب مجھے چھوڑ کر جاتا؟۔۔۔۔جا سکتا۔۔۔۔؟ بتاؤ نا قیوم بولو۔۔۔۔کبھی وہ مجھے چوڑ سکتا؟۔''

گفتگو کا کرونا میٹر پھر آفتاب کی ٹک ٹک بجانے لگا۔

''میں شاید احساس کمتری کا شکار ہوں ان دنوں۔۔۔۔میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔پھر بتاؤ ناں۔۔۔۔تم میرے محسن نہیں تو اور کیا ہو۔۔۔۔تم نے تمہاری محبت نے۔۔۔۔مجھے روک رکھا ہے اس دنیا میں۔''

فقتھ ائیر کی سیمی سے یہ لڑکی کتنی مختلف تھی۔گفتگو میں۔۔۔۔لباس میں کردار میں۔

''صرف محسن؟۔''میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اور اور۔۔۔۔کیا؟۔''لاتعلقی سے اس نے منہ پھیر لیا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ اگر اوپر سے دل سے بھی انکار وجود مان لیتی تو بھی میرے لیے بہت کافی ہوتا۔

''قیوم کیا وہ بھی ایسی باتیں کرتا ہوگا زیبا سے؟''

میں اس نام سے اچھی طرح آشنا تھا۔بارش سے پہلے چلنے والا جھکڑ۔۔۔۔جبلی

کے کھمبے، چھتنارے درخت بوسیدہ دیواریں گرانے والی ہائی وولٹیج کی بجلی۔

''کیسی باتیں سیمی؟۔''

''ویسی باتیں بیڈ روم ٹون میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔۔۔۔کرنے نہ کرنے والی سب باتیں۔۔۔۔''

''کیا تم بے وفا ہو سیمی؟''

''نہیں قیامت تک نہیں۔۔۔۔مجھے آفتاب سے محبت ہے اور قیامت تک رہے گی لیکن وہ بے وفا ہے۔''

میں نے کہنا چاہا کہ اچھی وفا ہے کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس کا سمجھ رہی ہو۔لیکن کوئی چیز میرے اندر بتا رہی تھی کہ وہ سچی ہے اور درست کہہ رہی ہے۔

''شادی کا خوشی سے اور محبت کا اختیار سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔حقوق و فرائض کا وارفتگی سے کیا ناطہ؟''

اس وقت میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نئے بوٹ پہن کر سیدھا ساندھا کلاں سے چلا آ رہا ہوں۔میرے انگوٹھے کے قریب گھٹے پڑ گئے ہیں۔جن میں اس وقت بہت درد ہو رہا ہے۔لیکن وہ کب سنتی۔کب سمجھتی؟

''کچھ کہو ناں۔۔۔۔کوئی فیصلہ کن بات جس سے یہ حسد کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے قیوم بولو۔۔۔۔تو سہی۔۔۔۔اپنے جوتوں کو پھر Admire کر لینا۔''

میں نے لمبی سانس لی اور اس کی تشفی لے کیے کہا۔''ہر شخص کی یہی مجبوری ہوتی ہے سیمی۔وہ ساری عمر ایک ہی سزا نہیں بھگت سکتا ایک ہی خوشی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔پھانسی کے تختے سے اتر کر بجلی کر کرسی پر بیٹھنا۔۔۔۔بجلی کی کرسی سے اٹھ کر صلیب چڑھنا، تہہ آب ہونا اور نہ مرنا۔پانی کی گہرائیوں سے نکل کر سر کو ہمسارے سے چھلانگ لگا جانا۔سیمی جان ہم سب ایک کرب سے نکل کر کسی دوسری

تکلیف کے حوالے ہو جانا چاہتے ہیں۔ایک خوشی سے منہ موڑ کر کسی اور خوشی میں ڈوبنا چاہتے ہیں۔یہ انسان کے لیے اتنا ہی نیچرل ہے جیسے وہ ایک ٹانگ پر ہمیشہ کے لیے کھڑا نہ رہ سکے۔آفتاب بھی تمہارے نا اسودہ لاحاصل عشق کے کرب سے نکلنا چاہتا تھا۔شاید اس تکلیف سے نکل کر وہ پہلے سے بھی زیادہ مصیبت میں ہو لیکن انسانی دل ایک ہی مصیبت ایک ہی غم ایک ہی بوجھ ساری عمر نہیں اٹھا سکتا۔کرب بھی رنگ بدلتا ہی رہے تو قابل برداشت رہتا ہے۔"

"تمہارا بہت بڑا دل ہے قیوم۔۔۔۔ہپو پوٹمس جتنا۔۔۔۔میں تم سے محبت نہیں بھی کرتی پھر بھی تم مجھے تسلیاں دیتے رہتے ہو۔۔۔۔تھینک یو۔۔۔۔تھینک یو۔۔۔۔تھینکس۔"

اس وقت میں سیمی کا کف اوپر کر رہا تھا

معاً میرے دل میں خیال آیا کہ قلب کا راستہ جسم سے ہو کر نہیں گزرتا۔قلب تک پہنچنے کے لیے صرف ٹیلی پیتھی، وجدان، ہپ نوٹزم میمرزم کی ضرورت ہے۔جسم روحانی عمل کو زمین میں ارتھ کر دیتا ہے میں نے بڑی تقدس سے سیمی کے کف بند کیے اور دل میں عہد کیا کہ اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔

انسانی روح کے لیے سب سے زیادہ مقطر اور طیب محبت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب سے بنی قابیل بنی ہابیل پر غالب آئے اصلی اور صادق محبت کا چشمہ قریب قریب سوکھ گیا اب جا بجا ہوس تھی۔۔۔۔جنسی تجربات تھے۔۔۔۔معکوس رابطے، نافراہمی اور نا اسودگی کی محبت تھی لوگ ایک دوسرے کو لتاجیض کی طرح استعمال کرتے اور چھوڑ جاتے۔محبت میں کجی اور کم فہمی کا رواج عام ہو گیا۔

محلوں میں ان کی نا آسودگی کہانیاں پھرنے لگیں۔اخباروں میں بے امن قصے بیان ہونے لگے۔جب سے بنی قابیل غالب آئے تھے سچی اور پاک محبت کی بارش

کے لیے کوئی دعا نہ مانگتا۔ سب ہی جنسی محرومی، قلبی تھکن اور روح کے کلاء کی وجہ سے دیوانے ہو رہے تھے ہر وہ شخص جس کی روح میں حرام مال پہنچ رہا ہو، چہرے بشرے سے راجہ گدھ بن جاتا ہے۔۔۔۔اس کی آنکھیں دھنسی ہو یہ چہرہ سبزی مائل پیلا، بال بکھرے ہوئے اور ہڈیاں نمایاں ہوتی ہیں روح کا حرام کھانے والا ہزاروں میں پہنچانا جاتا ہے ہزاروں میں لاکھوں میں پھر عجیب تھا کہ میرا ہمشکل سانڈھا کلاں میں دوسرا کوئی نہ تھا۔

میں اپنے محلّہ کا اپنے کالج کا سب سے بڑا راجہ گدھ تھا!

سیمی کی ناآسودہ محبت اب اپنے اثرات دکھانے لگی تھی۔۔۔۔گو اسے ملے مجھے کئی دن ہو چکے تھے لیکن میں ابھی تک اس کے مورفیا تلے پھرتا تھا۔ چاند راتوں رات کے پچھلے پہر مجھے Visious دکھائی دینے لگے **Ballueination** کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی مجھے اپنا سر گھومتا نظر آتا۔۔۔۔گلاس کے پانی میں مجھے چھوٹے چھوٹے مائیکروسوپ سے نہ نظر آنے والے جرثومہ صاف صاف نظر اتے۔۔۔۔ پھر بجلی کی تار پر آنے والی چھپکلی ڈائنا سوا س جیسی بڑی اور مہیب دکھائی دیتی۔ آسمان پر بادلوں کے رنگ آپس میں جڑ کر بڑی بڑی ملیئہ ناز شاندار عورتوں کی تصویریں بنکر لٹک جاتے اور اخبار کی اصلی سرخیوں کے اندر اور الفاظ اور ان الفاظ کے اندر اور تصویریں پر مخذ نظر آتیں۔ ان دنوں میں تلاوت الوجود میں مبتلا تھا بچپن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات اور ان واقعات سے منسلک تمام لوگوں کی ورق گردانی میں دن کا زیادہ حصہ گزرتا ہے میں بظاہر شیو کرتا کرتا کپڑے بدلتا، بھائی مختار کی موٹر سائیکل مانگ کر ریڈیو سٹیشن جاتا وہاں اپنی درخواست کی پیروی کرتا۔۔۔۔لیکن میرے اندر کا توازن بالکل بگڑ چکا تھا میں بیرونی حالات و واقعات میں زندہ نہیں تھا۔ میرے اندر شرح در شرح ایک ہی کتاب لکھی جا رہی تھی۔۔۔۔اور جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ اتنا ہی بے ربط تھا جیسے بندروں کا ایک جتھہ ٹائپ رائیٹروں پر کتاب لکھنے

کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔۔

یہ راجہ گدھ کی زندگی ہے۔

بیرونی کوائف سے کٹی ہوئی۔۔۔۔ اندرونی ہیجان میں الٹی صراحی کی طرح معلق۔۔۔۔ ایسی صراحی جس سے قل قل کر آواز تو آتی رہے لیکن ایک بوند پانی بھی کبھی نہ گر سکے۔

شاید ہمارا سارا گھرانہ ہی بن باسیوں کا تھا

ہم پرانے گدھ جاتی کے وہ راجپوتی لوگ تھے جنہوں نے راجھستھان میں پناہ لی تھی اور جو کھیتی باڑی کو منفعت بخش کام سمجھ کر اب پنجاب کی سرزمین میں آباد ہو گئے ہم راجپوتی لوگ اب غیرت اور ان کی تمام کہانیاں بھول چکے تھے وہ تلواریں خدا جانے کہاں تھیں جنہیں میدان کا راز بلاتا رہتا تھا اب محبت غیرت سچائی ساری غیر مرئی باتوں پر کٹ مرنے کی روایات ختم ہو گئی تھیں صرف تھوڑا تھوڑا دیوانہ پن رہ گیا تھا۔ اسی لیے کچھ کچھ واردا تیں اب بھی ہو جاتیں۔۔۔۔۔ ہماری ناکیں عقاب جیسی اور مونچھوں کے بال گرگٹ کے پٹھوں کی طرح تنے ہوتے تلوار کی سچی زبان ہمیں بھول چکی تھی لیکن اس کے باوجود لمبی چوڑی بحث، کٹ حجتی اور بے ہودگی میں ہم نے پناہ لی تھی بس خواب ہمیں پریشان کرتے تھے۔ ہر دیوانے کی طرح خوابوں میں ہمیں زیادہ حقیقت نظر آتی ماڈرن آدمی پر تہذیب اور تعلیم کا شہری زندگی کا جو بھی بوجھ ہے وہ ہمارے ہم قوم لوگوں پر بھی پڑ رہا تھا ہماری اندر کی جبلت ہمیں مارنے مرنے پر اکساتی تھی۔ کھلی ہوا چوڑے میدان کی طرف کھینچتی تھی اور معاشرہ ہمیں تال میل سمجھوتے پر اکساتا تھا۔ اسی لیے ہم بھی کئی صدیوں سے چوراہے پر کھڑے تھے ایک ایسی اندھی بتی کے نیچے جس کی بتیاں فیوز ہو چکی تھیں۔ لیکن ہم اشارے کے منتظر تھے ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ چاروں راستوں میں سے کون سا بہتر ہے، ہم کس راستے پر چل کر نجات ملے گی؟۔

ایک راہ گاؤں کو جاتی تھی۔۔۔۔ جہاں دن لمبے ہوتے ہیں نیند سکون سے آتی ہے لیکن غریبی میں تفریح کے بغیر قناعت کی ڈھال نہ ہوتے ہوی ءیہ سفر بہت لمبا اور تھکا دینے والا ہوتا ہے جہاں آدمی ہر روز کے اطمینان سے گھبرا جاتا ہے۔۔۔۔

دوسرا رشتہ شہر کو جاتا ہے چھوٹے شہر کی سڑکیں بڑے شہروں کو بڑے شہروں کے ہوائی جہاز اور بڑے چہروں کو اور وہاں سے جانے والے راستے کئی اور ملکوں میں نکلتے ہیں نئی کلچر، نئی تعلیمات، نئے لباس نئی زبانیں نئی چہرے نئی آگاہی۔۔۔۔اس راستے کے ہر سنگ میل پر نہ صرف اپنے اعتقادات مذہب کلچر اور سوچ کا پٹرول ہی جلتا ہے بلکہ ہر موڑ ہر سیاح بے اطمینانی کی سوغاتیں سوہان روح یادوں کے بیگج ٹکٹ اپنے پرس میں اکھٹے کرتا جاتا ہے ہر جگہ اسے اپنی ذات، مذہب ملک اور قوم کا ٹریولر چیک بھنوانا پڑتا ہے اور دوسرے ملک کی نعد البدل کرنسی حاصل کرنا ہوتی ہے

تیسری پگڈنڈی جنگل کو نکلتی ہے

یہاں ساری طرف اونچی اونچی گھاس ہے جس میں انسان کی اپنی جلی آرزوئیں پھن اٹھائے کھڑی رہتی ہیں ہر آرزو دلآویز بھی ہوتی ہے اور سر پر کلہاڑی مار کر ختم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے آرزوؤں کا یہ جنگل بڑا طلسماتی ہے اس میں اپنے مرنے اور دوسرے کو مارنے کا کھٹکا ساتھ ساتھ رہتا ہے تہذیب کی زنجیروں میں جکڑے انسان کو یہاں پہنچ کر بھی ہار کیری کرنے کے سوائے اور کچھ نظر نہیں اتا۔ کیونکہ یہ راستہ بھی منزل نا اشنا ہے صرف اسی گریڈ ٹرنک میں اور کئی راستے آ کر ملتے ہیں سڑک اور چوڑی ہو جاتی ہے لیکن ہمیشہ جنگل میں ہی چلتی ہے اس راستے میں اتنے پل آبشاریں نشیب اونچائیاں آتی ہیں کہ جہلت کی تلوار ہاتھ میں رہ جاتی ہے اور اپنی زرہ کے بوجھ تلے آدمی مر جاتا ہے

چوتھا راستہ غاروں کی طرف جا نکلتا تھا اور کسی کو معلوم نہیں کہ یہ غاریں کہاں جا نکلتیں ہیں۔سب ان بروحوں جنوں اور آسیبی رنگوں سے ڈرتے ہیں جن میں ڈبو

ڈبو کر انسان ہر پڑاؤ پر رنگ بدلتا جاتا ہے۔۔۔۔یہ مافق الفطرت راستہ گو مشکل نظر آتا ہے لیکن غاروں کے اندر کبھی کبھی پناہ بھی ملتی ہے اور ٹھنڈک بھی

ہم راجپوت تھے اور آج تک اسی چوراہے پر کھڑے تھے کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ہم سب کے اندر خواب اور حقیقت گڈمڈ ہو گئی تھی۔

بھابھی صولت کا چہرہ؟

بھائی مختار کی شکل؟

اماں۔۔۔۔؟ ابا۔۔۔۔کیا ہم سب انسانوں میں سے تھے؟

کیا ہماری شکلیں گدھوں سے مشابہہ نہ تھیں

ہم لوگ ضلع شیخوپورہ کے چندراں گاؤں میں رہتے تھے۔جس طرح چندرے آدمی کا ساتھ بالآخر چھوڑنا پڑتا ہے اسی طرح بالآخر ہم سے بھی یہ گاؤں چھوٹ گیا پتہ نہیں چندراں چندرماں سے بگڑا ہوا لفظ تھا کیونکہ جب بھی ہم گاؤں سے نکلے اس کی یاد چاندی کی طرح دمکنے لگتی۔

چندراں کو جانے والی کچی سڑک جس کے اردگرد ڈیلے کی خودرو خاردار جھاڑیاں تھیں بہت لمبی تھی۔گاؤں میں غریب غربا کے استعمال کی چیزیں بیچنے والی دو کانیں، آٹا پیسنے والی خراس تال میں ڈوبی بھینسیں، مٹی اڑانے والے یکے، چارہ کترنے والی مشینیں دو تنور اور بہت سی یادیں تھیں جو فاصلے کی وجہ سے خوبصورت ہو گئی تھیں بی اے کے بعد ان ساری یادوں کو تازہ کرنے میں دوبارہ چندراں گیا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ سارا گاؤں سیم اور تھور کی وجہ سے اس حد تک برباد ہو چکا ہو گا پورے چار سال گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے میں ان خبروں کی عینی شہادت نہ رکھتا تھا جو کبھی کبھار ابا کے خطوں میں درج ہوتی تھیں ماں کے مرنے کے بعد ہم دونوں بھائی چندراں نہیں گئے۔پہلے بھائی مختار نے ایک رسالے میں سب ایڈیٹری کی اور پھر جب وہ سیکرٹریٹ میں ملازم ہوئے تو اپنے خاندان سمیت وہ

ساندہ کلاں میں آ گئے۔

گاؤں میں ماں جو نہیں تھی!

گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے میں ہمیشہ ماموں کے پاس قصور چلا جاتا۔ کبھی مجھے چندراں کا خیال نہیں آیا۔

جس وقت بیگ اٹھائے گاؤں پہنچا میں نے دیکھا

اردگرد بڑے بڑے سور کے ڈھیر تھے کلر کے تختوں میں پرانے مرے ہوئے جانوروں کے ڈھانچے تھے کہیں کہیں زمین میں دلدل تھی کھارے پانی کے جوہڑ تھے۔ جن کے کنارے سبز گاچنی رنگی مٹی میں پیاسے جانوروں کے کھروں کے نشان گہرے ہو کر خشک ہو چکے تھے یہ جانور پانی کی تلاش میں آئے تو ضرور لیکن پیاسے لوٹ گئے۔

سارا گاؤں بے آباد پڑا تھا کسی کسی آنگن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لیکن گلیاں سونی تھیں بہت سے کچے پکے گھروں کے دروازے جانے والے مکینوں کی یاد میں کھلے پڑے تھے اب ان گھروں میں چرانے کو بھی کچھ باقی نہ رہا تھا اول تو جانور کم تھے اور جو باقی تھے ان کی ہڈیاں کولہے نکلے ہوئے تھے۔ بیلوں کی آنکھوں میں اداسی تھی اور بھینسیں ہراس کی وجہ سے آنکھیں نہ ملاتی تھیں بچے دہلیزوں پر چپ چاپ بیٹھے وقت گزارنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اور گھٹنے بہت نمایاں ہو چکے تھے۔

یہ وہ چندراں نہیں تھا جس سے چار سال پہلے میں رخصت ہوا تھا

تب تو ہرے ہرے کھیتوں میں تانگہ جاتا ہوا نظر بھی نہ آتا تھا۔ تب تو ہماری حویلی میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی قیام پاکستان کے بعد اس گاؤں میں کئی رنگ کے پکھیرو آباد ہو گئے تھے بڑے لونگ اور ستواں ناک والی راجپوتنیاں، گول گول دیپوں والی کشمیرنیں چوڑے طباق والی مٹی رنگی جاٹ عورتیں، چکنی جلد پر نارنگی کے چھلکے ملنے والی مغل زادیاں، خوشامد سے دوسہری ہو جانے والی میراثنیں، پل میں

صحن کا رنگ بدل دینے والی ککے زینیں ناپ تول کی تکڑی کے باٹ جیسی زندگی بسر کرتی شیخانیاں، جلدی ڈھل جانے والی زرد زرد آرائیں استریاں کھلی بیسن سے نہائی دھوئی گجریاں چوڑے چھنکانے اور طعنے دینے والی مسلنیں ۔۔۔۔۔ماں زندہ تھی تو چندراں کا گاؤں اور پھر ہماری حویلی کچھ اور ہی چیز تھی۔

سارے درخت ہرے بھرے تھے سب کھیت لہلہاتے تھے۔ ہر کنوئیں میں میٹھا پانی تھا ہر کسان کے گھر میں دانے تھے اب سارے میں کلر ہی کلر تھا موت ہی موت تھی۔اور اماں کہیں بھی نہیں تھی۔

جب میری ماں زندہ تھی تو حویلی کے آنگین میں ہر سے میلے کی سی کیفیت رہتی دو آرہی ہیں دو جا رہی ہیں میری ماں ان عورتوں میں نظر نہ آتی۔پھر بھی اس کی وجہ سے میلہ لگا رہتا۔ وہ جہاں بیٹھی وہی جگہ آباد ہوگئی اور کچھ نہیں تو اس کی چارپائی تلے چیونٹیوں ہی راستہ بنا لیتیں۔ ماں عام طور پر حویلی میں کسی جگہ بھی نہ ہوتی تھی پر اس کے کیے ہوئے کام ہر جگہ اس کی گواہی دیتے کہیں چارہ کٹا ہوا ملتا کہیں نارنگیوں کے چھلکے سوکھنے کے لیے پڑے ہوتے۔سوتی کپڑوں کی رنگین کترنیں مکئی کے خالی تکے گنوں کے چھلکے۔۔۔۔بادام کی زاہ کھلی۔۔۔۔ماں تھی تو آنگین آباد تھا۔گاؤں زندہ تھا۔

اب ہماری حویلی کے تمام دروازے کھڑکیاں کھلی تھیں۔۔۔میں نے ابا کو آواز دی۔۔۔"ابا"۔۔۔۔۔اندر والے کمرے سے ایک کبڑا بوڑھا کچھ پہچانتا کچھ بھلاتا میری طرف بڑھنے لگا۔

اس بڈھے گدھ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں انسو آگئے

آنگین کے سارے فرش کی کی اینٹیں کلر چاٹ گئی تھی اور اب جب ان پر پاؤں پڑتا تو پھک سے سفید ذرات اوپر کو اٹھتے تھے ٹوٹی ہوئی ربڑ کی ہوئی چپل میں جو شخص مجھے بھولتا اور پہچانتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا جس کے سر کے تمام بال سفید تھے۔اور

جبڑے کی ہڈیاں کسی ہوئی تھیں۔ یہ شخص میرا باپ تھا۔

چار سال سے میں نے کبھی اس کا پتہ نہیں لیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زمین کلرزدہ ہو جانے پر اب وہ کیسے گزر بسر کرتا ہے۔

آنکھوں کا چشمہ ناک پر جماتے ہوئے وہ بڑھتا آ رہا تھا۔۔۔۔ ''کون ہے کون ہے بھئی بولتے کیوں نہیں؟۔''

میں سوٹ کیس ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ جو حویلی کے کئی طاق کھلے تھے کئی دروازے ہوا میں جھول رہے تھے۔۔۔۔ ہوا میں ایسا نمک تھا جو پسینے والے بدن سے چپک کر خارج میں بدل جاتا ہے۔

''کون ہے بھئی۔'' ابا نے پاس آ کر کہا۔

پھر اور قریب آ کر اس نے بازو پھیلائے۔ لمحہ بھر کو بازو پھیلے رہے پھر شرمندہ ہو کر اس اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا اور بولا۔۔۔۔ ''آؤ قیوم آؤ کھڑے کیوں ہو۔''

ہم دونوں چپ چاپ اس تخت پوش پت بیٹھ گئے جس پر بیٹھ کر کبھی اماں سارے گاؤں میں حکم چلایا کرتی تھی

''ابا۔۔۔۔ بھائی مختار نے کہا ہے۔''

''کس نے۔؟۔''

وہ اونچا سننے لگا تھا

''بھائی مختار نے کہا ہے۔۔۔۔ کہ اب تو چندرا چھوڑ دے میں تجھے لینے آیا ہوں۔''

''آ میرے ساتھ۔۔۔۔ آ۔۔۔ ذرا۔۔۔۔''

میں ابا کے ساتھ چلنے لگا وہ مجھے ساری حویلی میں لیے پھرا۔۔۔۔ گھر کی حالت ساختہ تھی، کہیں رنگین پائے کا پلنگ آخری دموں پر تھا، کہیں جستی ٹرنک کلر میں ڈوبے

تھے۔۔۔۔ساری جگی آسیب زدہ تھی وہ گھوم پھر کر میرے ساتھ باہر آ گیا اور پھر تخت پوش پر بیٹھ کر بولا۔۔۔۔"دیکھتا نہیں تیری ماں کی کتنی نشانیاں ہیں یہاں۔۔۔۔ کس کس کو چھوڑ کر جاؤں؟"

میں چپ ہو گیا۔

"ابا بھائی مختار ساندھا کلاں میں رہتے ہیں۔"

"رہے جم جم جی صدقے۔"

"بھابھی صولت نے بھی ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔۔ہے۔۔۔۔تو میرے ساتھ تو چل ابا۔۔۔۔میری پڑھائی کے بھی دو سال باقی رہ گئے ہیں۔"

وہ کھانسنے لگا مدافعت کے طور پر۔۔۔۔شرمندگی کے احساس تلے وہ اس وقت مجھے اپنا باپ نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا جانور لگ رہا تھا۔۔۔۔معصوم جانور جس نے سونے کے فریم کی عینک پہن رکھی تھی۔

"تو نہیں سمجھتا ناں۔۔۔۔یہاں وہ اور میں باتیں کرتے رہتے ہیں سارا دن وہاں شاید شہر میں وہ میرے ساتھ جانا پسند نہ کرے۔"

میں نے غور سے ابا کی طرف دیکھا۔

جب ماں زندہ تھی تو ہم نے ان دونوں کو کبھی باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن جب ماں مر گئی تو پھر ابا اس کے شیشے لگے بڑے پلنگ پر لیٹ کر پہروں منہ میں باتیں کرتا نظر آتا۔اماں کے ہوتے ہوئے ابا ہمیشہ کھیتوں پر رہتا تھا اندر صحن میں رنگ رنگ کی عورتوں کا میلہ دیکھ کر گھر لوٹنے پر بھی وہ حویلی کے باہر ہی مونڈھا منگوا لیتا۔لیکن اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ امریکہ کا پریذیڈنٹ ہو۔اس کے حقے کی نے مونڈھے کی بٹھاوٹ اور نشست وہاں سے صاف نظر آتی جہاں صحن کے اندر ماں کا تخت بچھا ہوتا۔دونوں میں شاید کوئی پیغام جاری رہتے ہوں اس کا ہمیں علم نہ تھا۔

ماں کے مرنے کے بعد حویلی دم چھوڑ گئی۔۔۔۔میلہ ٹوٹ گیا۔۔۔گاؤں کے اردگرد تو بہت پہلے سے سیم نالہ بہتا تھا اور زمین شور زدہ ہو رہی تھی لیکن اب ابا بھی پڑا رہا آہستہ آہستہ ہماری زمینوں پر بھی کلر رینگنے لگا ابا کی آواز میں خوف پیدا ہو گیا۔اس کے بازوؤں پر جھریاں نظر آنے لگیں۔اب ابا جھکتا تو کھڑے ہونے سے پہلے کمر پر ہاتھ رکھ لیتا۔اس کی آنکھوں میں اب تیل والے خشک چراغ جیسی کیفیت تھی۔جیسے کبھی جلتا تھا لیکن اب صرف گیلا رہتا ہو۔دسویں جماعت میں نے قصور میں ماموں کے پاس رہ کر پاس کی۔اس وقت تک مختار بھائی لاہور میں ملازم ہو گئے تھے ان کی بیوہ اور بڑا بیٹا سانده کلاں میں کرائے کا مکان لے کر رہنے لگے تھے میں نے باقی تعلیم ہوسٹل میں رہ کر مکمل کی۔لیکن ساری چھٹیاں میں ماموں کے پاس قصور میں گزارتا تھا۔مجھے کبھی چندرا جانے کا خیال نہیں آیا۔۔۔۔میں اماں کے بغیر چندرا کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابا سے ملنے کو جی چاہتا۔لیکن ہم دونوں بھائی ہمیشہ سے باہ سے دور دور رہے میرے ذہن میں ابا سانڈل کا سانڈ تھا جس کا جسم لس لس کرتا ہے، جو کھیتوں میں کھڑا چرتا ہے بے ضرر لگتا ہے لیکن کوئی کسان اسے کھیت سے نکالنے کی جرائت نہیں کرتا۔پاس جانے پر آمادہ بھی نہیں ہوتا۔مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے گاؤں کو کلر نگل رہا ہے۔لیکن میں کلر کھائے گاؤں کو کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایک کلر ایسا بھی ہوتا ہے جو سانڈل بار کے سانڈ کو بھی کھا جاتا ہے۔

''دیکھو قیوم۔۔۔۔!یہ میرا گھر ہے۔۔۔۔میرا۔۔۔۔اگر میں اسے چھوڑ گیا تو گاؤں والے کیا کہیں گے۔''

میں پلٹ کر اپنے باپ کو دیکھا۔وہ کسان نہیں تھا۔سانڈل بات کا سانڈ نہیں تھا۔وہ صرف راجا گدھ جو ایک مری ہوئی عورت کے لاحاصل تصور میں اپنی زندگی کی ڈوری لٹکائے بیٹھا تھا